خطباتِ بہاولپور خطبہ ۱۲
عہدِ نبویؐ میں تبلیغِ اسلام
اور غیر مسلموں سے برتاؤ
ڈاکٹر محمد حمید اللہ
/payamequran
/Dr.Muhammad.Hamidullah

زیرِ نظر مضمون "عہدِ نبویؐ میں تبلیغِ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ" دراصل اس سلسلے کا بارھواں لیکچر ہے جو ۱۹۸۰ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مرحوم) نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں مسلسل بارہ روز متعدد اسلامی موضوعات پر دیے تھے جو خطباتِ بہاولپور کے نام سے شائع ہوں چکے ہیں۔

فہرست

کچھ مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب 1908ء کو علوم اسلامیہ کے گہوارے حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے، ایل ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے یورپ پہنچے۔بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی سند پائی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ اردو فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کو قبول عام حاصل ہوا۔عالمی شہرت یافتہ کتاب Muhammad Rasul Allah کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ

The Battlefields of Prophet Muhammad

The Muslim Conduct Stare

The First Written Constitution

الوثائق السیاسیہ العھد النبوی والخلافۃ الراشدہ

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں علم حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا اہم ترین کارنامہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" کی تحقیق و اشاعت ہے۔ یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث ہے جو عہدِ صحابہ میں مرتب ہوا تھا۔ آپ نے اس نادر و نایاب ذخیرہ حدیث کا ایک مخطوطہ برلن میں دریافت کیا اور اسے جدید اسلوب تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کرایا۔خدمت قرآن کے سلسلے میں آپ نے پچپن برس قبل تراجم قرآن حکیم کی ببلیو گرافی "القرآن فی کل لسان" مرتب کی جس میں دنیا بھر کی ایک سو بیس زبانوں میں قرآن کے تراجم کا تذکرہ اور بطور نمونہ سورہ فاتحہ کے تراجم درج ہیں۔

تو یہ ہے اس شخص کا مختصر تعارف جس نے مغرب کی نئی نسل کو اسلام سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔جو تقریباً نصف صدی سے زائد علم کے موتی لٹاتا رہا، جو زندگی کی آخری سانس تک فاطمہ کے بابا کے عشق میں سلگتا رہا۔۔۔جلتا رہا۔۔۔جلاتا رہا

خدا اس پر رحمتیں نچھاور کرے۔

محترم صدر! وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ و مہمانانِ گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ رب العالیمین ولاصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ واصحاب اجمعین!

رسول، کریم ﷺ کی زندگی کے دو پہلو ہیں جو حقیقت میں ایک ہی پہلو کے دو جز ہیں یعنی اسلام کی تبلیغ اور اس تبلیغ کو قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ آپؐ کا برتاؤ۔ آج ہم ان کے بارے میں بات کریں گے۔ یہ برتاؤ کچھ تو خود رسول اللہ ﷺ کی سنت یا آپؐ کے ذاتی طرزِ عمل پر مبنی ہوگا اور کچھ ان احکام پر مبنی ہوگا جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں پائے جاتے ہیں۔ میرے علم میں ایسی کوئی جامع کتاب نہیں ہے جو صرف اس موضوع پر لکھی گئی ہو۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تاریخی حیثیت سے دیکھوں کہ رسول کریم ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کا طرزِ عمل کیا رہا اور کس طرح آپؐ اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتے رہے؟ پھر اس کا جو ردِ عمل ہوا، اس سلسلے میں آپؐ کا برتاؤ کیا رہا؟ کس طرح آپ اس کا مقابلہ کرتے رہے اور تاریخی نقطہ نظر سے اس کے کیا نتائج نکلے؟ ہمیں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ پہلے دن کی وحی میں تبلیغ کا کوئی حکم نہیں ہے۔ پہلی وحی سے آپ سب لوگ واقف ہیں کہ وہ سورۂ اقراء (96:۱-۵) کی پہلی پانچ آیتیں ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے آپؐ کی امت کو یہ حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ تین سال تک ایک تک وقفہ رہا جس کے لیے فترۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس دوران کوئی نئی وحی نہیں آئی لیکن دوسری وحی نہ آنے کے باوجود یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ ان پہلی آیتوں میں صاف طور پر تبلیغ کا حکم نہ ہونے کے باوجود عملاً اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں تھے۔ میرے علم میں یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ مکے میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ وحی کے فوراً بعد آپ شہر واپس آجاتے ہیں اور اپنے مکان میں پہنچ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں: زملونی زملونی (مجھے کمبلوں سے ڈھانپو، مجھے کمبلوں سے ڈھانپو)۔ ظاہر ہے بیوی نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ کچھ تو اس سردی کی شدت کا اثر سے اور کچھ اس وحشت کی وجہ سے جو جبرئیل علیہ السلام کی آمد اور متعلقہ واقعات کے مشاہدے کے باعث پیدا ہوئی،

آپؐ کی حالت غیر تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو رسول کریم ﷺ نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنانے کے بعد آخری بات یہ کہی کہ کیا یہ شیطان کی کارستانی تو نہیں ہے؟ میں کوئی کاہن تو نہیں ہو گیا ہوں حالانکہ میں ساری زندگی، ان لوگوں کو، جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، برا کہتا رہا ہوں۔ آپؐ کو بیوی تسلی دینے کے لیے کہتی ہے کہ یقیناً ایسا نہیں ہو گا کیونکہ آپ زندگی بھر لوگوں کی مدد کرتے رہے ہیں۔ غریبوں، محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کرتے رہے ہیں، اس لیے خدا ایسے شخص کا ساتھ نہیں چھوڑے گا، یقیناً خدا آپؐ کو شیطان کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کے بعد آپؐ کی بیوی نے ایک جملہ اور کہا کہ میرا چچازاد بھائی جس کا نام ورقہ بن نوفل ہے، وہ ان چیزوں سے بہت واقفیت رکھتا ہے، کل ہم اس کے پاس جائیں گے۔ آپؐ اس سے اپنا قصہ بیان کیجئے گا۔ وہ آپ کو اچھی طرح سے بتا سکے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔

اس کے بعد دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں، جو عیسائی تھا۔ دوسری روایت کے مطابق، اگلی صبح (غالباً حسبِ عادت) حضرت ابو بکرؓ آپؐ کے پاس تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے ان کو یہ واقعہ سنایا، یا یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمائش کی کہ وہ ابو بکرؓ کو یہ واقعہ سنائیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس بھیجا۔ ورقہ بن نوفل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف العمری کے باعث نابینا ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ سن کر اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "جو کچھ تم نے بیان کیا ہے اگر یہ سچ ہے تو ناموس موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا جب تمہاری قوم تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے گی اور تمہیں اپنے شہر سے نکال دے گی تو اس وقت میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تمہاری مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔" رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ کیا اس بات پر' کہ میں خدا کا پیغام لوگون تک پہچاؤں، لوگ مجھ پر ظلم و ستم کریں گے، اذیتیں دیں گے، اور مجھے اس ملک سے نکال دیں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا" ہاں! کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کو اس کی امت نے تکلیف نہ دی ہو۔"

اب میں لفظ ناموس پر کچھ بحث کروں گا۔ عام طور پر اردو میں یہ لفظ عزت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زیرِ بحث سیاق وسباق میں معنی نہیں لیے جاسکتے۔ ہمارے بعض مفسر یہ کہتے ہیں کہ ناموس کے معنی قابلِ اعتماد چیز کے ہوتے ہیں۔ یہ معنی بھی یہاں مناسب نظر نہیں آتے۔ میں شاید یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ جس سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں ایک اور معنی مراد لینے کی ضرورت ہے۔ ورقہ بن نوفل نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ بخاری کی حدیثوں میں بھی ہے، کہ انہیں سریانی زبان آتی تھی اور سریانی سے عربی میں انہوں نے انجیل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان حالات میں

کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ سریانی زبان میں موجود ایک یونانی لفظ ہو۔ اگر اس مفروضے کی بنیاد پر غور کریں تو فوراً اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یونانی زبان میں توریت کو "نوموس" (Nomos) ہی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو پیغام آپؐ پر نازل ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ ظاہر ہے یہ لفظ اس مفہوم میں زیادہ چبھتا ہے اور زیادہ مناسب و معقول لگتا ہے۔

ان ابتدائی واقعات کے بعد، بجز مفروضات کے یہ کہنا مشکل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا تھا۔ غالباً وہ بار بار مختلف لوگوں اور پوچھنے والوں کو اپنا واقعہ سناتے رہے ہوں گے کہ جبرئیل نے مجھے یوں کہا اور مجھے یہ بتایا۔ میں ایک چھوٹی سی بات کا تکملہ کرتا چلوں۔ پہلی وحی کے سلسلے میں بلاذری کی "انساب الاشراف" میں کچھ تفصیلیں اور بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورۂ اقراء کی پہلی پانچ آیتوں کے ابلاغ کے بعد حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ کو اولاً استنجے کا طریقہ بتایا کہ اپنے جسم کو نجاست سے کس طرح پاک کریں۔ اس کے بعد وضو کا طریقہ بتایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور سے تیار کرنا چاہیئے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نے امام بن کر نماز پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ نے مقتدی بن کر اسی طرح نماز پڑھی۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام چلے گئے۔ ان حالات میں سیرت کی کتابوں میں یہ روایت پڑھ کر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ دونوں وقتاً فوقتاً کعبے کے سامنے علانیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ نماز مکہ والوں کی عبادت سے، ظاہر ہے، مختلف تھی جس کے باعث لوگ انہیں حیرت سے دیکھتے تھے۔ ابھی تک قرآن کی وہ آیتیں نازل نہیں ہو یہ تھیں جن میں بت پرستی کو برا بھلا کہا گیا تھا اور بتوں کی پرستش کرنے والوں کو جہنم میں جانے کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس نئے دین کے متعلق استعجاب ضرور ہوتا ہو گا لیکن ابھی ان میں کوئی عناد یا غصہ پیدا نہیں ہوا ہو گا۔ بہر حال ان دنوں دو تین مسلمان نظر آتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ، ان کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کے بعد آپ کے چچازاد بھائی جو آپ کے متبنیٰ بیٹے بھی تھے یعنی حضرت علیؓ، ان کے بعد آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ۔ گویا اولین مسلمانوں کی جماعت ان پانچ سات آدمیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علیؓ کے اسلام لانے کے بارے میں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق چونکہ وہ بہت کم سن تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتا دیکھ کر خود بھی آپؐ کی تقلید کرنے لگے۔ دوسری روایت جو غالباً کچھ عرصے بعد کی ہو گی، یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کعبے کے سامنے نہیں بلکہ شہر کے باہر صحرا میں یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دونوں چھپ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو وہ ان کی ٹوہ میں پیچھا کرتے ہیں۔ جب دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ بھی وہاں کھڑے رہتے ہیں۔ نماز کے اختتام پر پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز تھی؟ جب رسول اللہ ﷺ بتاتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور میں اللہ کا نبی ہوں تو وہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ حضرت علیؓ کے اسلام لانے کے بارے میں ایک تیسری روایت بھی

ہے۔ان اختلافی روایات کی وجہ یہ کہنا دشوار ہے کہ حضرت علیؓ نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیسری روایت پہلی وحی نازل ہونے کے کم از کم تین سال بعد کی ہے۔رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی تبلیغ کریں: وانذر عشيرتك الاقربين (۲۶ : ۲۱۴) (اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ سے ڈراؤ) چنانچہ رسول اکرمؐ نے اس خدائی حکم کی تعمیل میں تبلیغ کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ بازار سے فلاں فلاں چیز خرید لاؤ اور بیوی سے کہا کہ ان سے ایک جیافت کا اہتمام کرو۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا کہ خاندان کے سارے گھروں میں (چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں کے پاس) جاؤ اور انہیں دعوت دو کہ فلان دن اور فلاں وقت کھانے کے لیے میرے پاس آئیں۔عام کتب، سیرت میں ہے کہ پہلی مرتبہ لوگ آئے تو تھوڑی مقدار میں کھانا بہت سے (تیس چالیس) آدمیوں کو کافی ہو گیا۔اس معجزے کو دیکھ کر ابو لہب نے استہزاء کیا کہ یہ جادوگر ہے۔رسول اللہ ﷺ سخت متاثر اور ملول ہوئے اور کچھ بول نہ سکے۔چند دن کے بعد رسول اکرم ﷺ نے مکرر دعوت دی، اور اس دن ان کی تبلیغ کی۔یہ عام روایت ہے، لیکن میرا گمان ہے کہ پہلی مرتبہ چونکہ ان لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ کس غرض سے بلایا گیا ہے وہ آئے لیکن سب ایک وقت میں میں نہیں آئے اور کھانا کھا کر جاتے رہے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخری شخص کے کھانا کھا چکنے کے وقت سوائے اس آخری شخص کے کوئی اور آدمی موجود نہ تھا۔اس لیے اصل مقصد کہ خاندان کے لوگوں میں تبلیغ کریں پورا نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ وہی تدبیر اختیار کی۔حضرت علیؓ خاندان والوں کو اطلاع دیتے ہیں۔اس مرتبہ رسول اللہ ﷺ احتیاطاً کہتے بھی جاتے ہیں کہ کھانے کے بعد میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، ٹھہرنا انتظار کرنا۔ چنانچہ اب کی بار سب لوگ اس تجسس میں بیٹھے رہے کہ دیکھیں وہ کیا بات ہے جس کے لیے ہمیں بلایا گیا ہے۔ کھانے کے بعد رسول اللہ ﷺ ان سے مخاطب ہو کر بتاتے ہیں کہ بت پرستی کیوں بری ہے۔اللہ کو ایک ماننا کیوں ضروری ہے۔ پھر اس کے نتائج یعنی آخرت کی زندگی اور خدا کے سامنے حساب کتاب کا ذکر کیا۔اس طرح کی چند بنیادی باتیں لوگوں کو بتائیں۔اس سلسلے میں طبری کی روایت بہت دلچسپ ہے۔طبری کا بیان ہے کہ اس تبلیغ کا غالباً آخری جملہ یہ تھا کہ تم میں سے جو شخص میری دعوت قبول کرے گا وہ میرا جانشین اور خلیفہ ہو گا۔ کہتے ہیں اس وقت حضرت علیؓ، جو ابھی بچے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ کا چچا ابو لہب قہقہہ مار کر ہنسا اور تالی بجا کر کہنے لگا۔ابو طالب مبارک ہو۔ آج سے تم اپنے بیٹے کے ماتحت بن چکے ہو۔اس سے ابو طالب کو خفت سی ہوئی اس لیے وہ ساری عمر اس کے لیے آمادہ نہیں ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت قبول کر لیں۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ "خلیفہ" سے کیا مراد ہے، خاص کر اس لیے کہ امکان تھا کہ کئی لوگ اس دن مسلمان ہو جاتے اور ہر ایک خلافت کا مستحق بنتا۔شاید حدیث "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" بھی اس کی تائید کرتی

ہے۔ اس بیان کا منشا تبلیغ کا طریقہ بتانا تھا۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ حضرت علیؓ کیسے ایمان لائے یا وہ کب ایمان لائے؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسری وحی نازل ہوتی ہے، جس میں یہ حکم آتا ہے کہ فاصدع بما تومروا عرض عن المشرکین (۱۵ : ۹۴) (جس چیز کا تجھے حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر بیان کر اور مشرکوں کی پروانہ کر)۔ اس حکم کے آنے پر رسول اکرم ﷺ ایک طرح کی دہشت محسوس کرتے ہیں کہ سارا شہر بت پرست ہے، اگر میں یہاں کے لوگوں کو برملا یہ کہوں کہ تمہارا دین غلط ہے، اور تمہارے بت تمہارے لیے حفاظت اور نجات کا باعث نہیں بن سکتے، تو لوگ خفا ہوں گے اور استہزاء بھی کریں گے۔ حضرت جبرئیلؑ نے پھر آکر تشفی دی کہ اللہ آپ کو نہیں چھوڑے گا، اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ اس پر ایک دن رسول اللہ ﷺ شہر سے باہر ایک پہاڑی کے کسی بلند حصے پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ جیسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں فلاں قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ جو لوگ اس قبیلے کے نہیں تھے وہ چلے گئے۔ پھر اس کی ایک شاخ کا ذکر کیا کہ میں صرف ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ غرض بجائے سارے شہر کے لوگوں کو خطاب کرنے کے اس کے ایک محدود حصے کو اس دن آپؐ نے مخاطب کیا۔ خطاب کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ اے بھائیو! اگر میں تم سے بیان کروں کہ اس پہاڑ کے پیچھے، دوسری طرف ایک دشمن کی فوج آئی ہوئی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم میری بات پر اعتماد کرو گے؟ ان کا جواب تھا کہ ہم نے تمہیں آج تک جھوٹ بولتے ہوئے نہیں پایا۔ اگر تم سنجیدگی سے کہتے ہو کہ واقعی کوئی دشمن اس طرف آیا ہوا ہے اور پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں کہ مین تم اس انسانی لشکر سے بھی بڑے ایک دوسرے لشکر سے ڈراتا ہوں، یہ اللہ کا قہر اور عذاب ہے۔ اگر تم اللہ کو ایک نہ مانو گے اور بتوں کی پرستش نہیں چھوڑو گے تو مرنے کے بعد اللہ تمہیں دوزخ میں ڈال دے گا۔ اس دن اور لوگون کے علاوہ آپ کا چچا ابو لہب بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے جل کر کہا "کیا اس فضول بات کے لیے تم نے ہمارا وقت ضائع کیا؟" اور وہ چلا گیا۔ دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔

اس وقت بے محل نہ ہو گا اگر میں یہ بیان کروں کہ ابو لہب کو اپنے بھتیجے رسول اللہ ﷺ سے نفرت کیوں پیدا ہو گئی تھی؟ بلاذری نے انساب الاشراف میں اس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن گھر میں دو بھائی یعنی ابو لہب اور ابو طالب کسی بات پر لڑ پڑے۔ اولاً ابو لہب نے اپنے بھائی کو زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ کر طمانچے لگائے۔ اس کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ جو ان دنوں دادا کی وفات کے بعد ابو طالب کی کفالت میں تھے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ابو لہب کو ابو طالب کے سینے سے دھکیل کر

ہٹاتے ہیں۔ اس طرح ابو طالب کو اٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اب وہ ابو لہب کو زمین پٹخ دیتے ہیں اور اس کے سینے پر چڑھ کر اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں۔ ابو لہب جل کر کہنے لگا: "اے محمد (ﷺ)! ابو طالب بھی تیرا چچا ہے اور میں بھی تیرا چچا ہوں۔ پہلے تو نے ابو طالب کی مدد کی لیکن اب میری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟ خدا کی قسم! میرا دل تجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گا۔" بلاذری کی انساب الاشراف میں یہ ایک چھوٹا سا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جو لوگ جتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اتنا ہی وہ چھوٹی سی چیز کا زیادہ اثر لیتے ہیں اور ان کے دلوں پر اس کا دیرپا اثر رہتا بلکہ روز افزوں ہوتا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو جس کی بنا پر ابو لہب کو رسول اللہ ﷺ سے عداوت پیدا ہو گئی اور کبھی اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اسے اسلام کے انتہائی شدید دشمنوں میں سے ایک قرار دیا گیا۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ محمد ﷺ نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کا دین غلط اور لغو ہے۔ جن چیزوں کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی اور جلد ہی وہ نوبت آگئی کہ شہر کی حکومت اور سربر آوردہ نے بھی انہیں اس بات سے منع کر دیا کہ خانہ کعبہ کے سامنے آکر اپنے طرز کی عبادت کریں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ ﷺ یا تو اپنے مکان میں نماز پڑھتے یا گھر سے باہر کسی جنگل یا صحرا میں عبادت کرتے۔ لیکن کافروں کی چھیڑ خانی میں کمی نہیں آئی۔ لوگ آپؐ کے پاس آتے، آپ سے بحث کرتے، آپؐ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے۔ ان میں آپؐ کا چچا ابو لہب پیش پیش رہتا۔ اسے پتا چلا کہ جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو اس وقت رسول اللہ ﷺ چھپتے چھپاتے خانہ کعبہ کے سامنے آتے ہیں اور وہاں اپنے طرز کی عبادت یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ آپؐ کی گزرگاہ میں خاردار درختوں کی شاخیں لا کر ڈال دیتا اور مکان کی دہلیز پر گندگی اور غلاظت لا کر ڈالا کرتا تھا۔ یہ وہ رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو پیغام پہنچانے میں دشواری ہوتی رہی لیکن آپ نے ہمت نہ ہاری اور تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ پھر ایک نئی مشکل سے آپؐ کو سامنا کرنا پڑا، وہ یہ کہ مکے کے باشندے وقتاً فوقتاً گلی کے لونڈوں کو ترغیب دلاتے تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے جائیں، ان پر پتھر پھینکیں اور انہیں یہاں سے نکالیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کا بدتمیز لڑکے پیچھا کرتے تو مقریزی نے بیان کیا ہے کہ ایسے وقت اگر رسول اللہ ﷺ کبھی اتفاق سے ابو سفیان کے مکان کے قریب ہوتے تو ابو سفیان کے گھر میں چلے جاتے اور ابو سفیان مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس قدر شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتا کہ فوراً رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرتا اور گلی کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ اطمینان سے اپنے گھر جاتے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد مقریزی نے ایک بہت بعد کے واقعے کی طرف چھوٹا سا اشارہ کیا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ

مکہ کو فتح کرتے ہیں تو ہمارے مؤلف لکھتے ہیں کہ فوج کے ہراول دستے یا مقدمتہ الجیش میں ایک منادی کرنے والا تھا جو گلیوں سے گزرتے وقت با آواز بلند، چلا چلا کر کہتا جاتا تھا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو شخص اپنے گھر کے اندر بند رہے، باہر نہ نکلے، امن میں رہے گا۔ جو حرم کعبہ میں چلا جائے گا وہ امن میں رہے گا اور آخری چیز جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہ یہ کہ جو شخص ابو سفیان کے مکان میں جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔ مقریزی کہتے ہین کہ یہ امتیاز اور خصوصیت اس واقعے کی بناء پر تھی کہ زمانہ قبل ہجرت جب کبھی مکے کے شریر بچے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دیتے اور آپؐ ابو سفیان کے گھر جاتے تو ابو سفیان آپ کو پناہ دیتا تھا۔ لہٰذا اس کے بدلے میں ابو سفیان کے مکان کو بھی پناہ گاہ قرار دے دیا گیا۔

اس تبلیغ کا سلسلہ کوئی چار پانچ سال جاری رہا۔ اس عرصے میں کفار کے ظلم و ستم اور اذیتوں کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ انہیں اپنے ملک میں رہنا دشوار ہوگیا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا کہ وہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی حکومت کرتا ہے، جس کے ملک میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ وہ لوگ حبشہ پہنچ گئے۔ اب چونکہ تبلیغ کی آزادی تھی، اس لیے یہ مسلمان (مکے کے نو مسلم مہاجر) حبشہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں وہاں کافی تعداد میں یعنی کم از کم چالیس پچاس حبشی مسلمان ہوگئے۔ لیکن اس سلسلے میں انہیں دشواریاں بھی پیش آئیں۔ جب مکے کے نو مسلم ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکے کے مشرکوں نے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اس وفد نے جا کر یہ مطالبہ کیا کہ ان مسلمانوں کو ہمارے سپرد کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں واپس لے جا کر پھر تکلیفیں دیں اور ستائیں۔ نجاشی نے صرف مطالبے کی بنا پر فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ تم لوگوں کے متعلق الزام ہے کہ تم اپنے شہر میں فتنہ وفساد کرتے رہے ہو اور وہاں کی سزا سے بچنے کے لیے یہاں آکر پناہ گزین ہوگئے ہو۔ تم لوگوں کا کیا جواب ہے؟ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی جعفر بن طیارؓ جواب دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں یہاں جواب ذکر کروں، ایک ذاتی استنباط آپ سے بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ رسول اللہ ﷺ کے مکتوبات میں نجاشی کے نام ایک مکتوب ہمیں ایسا بھی ملتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ "میں اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب وہ پہنچے تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی مہمانداری کر، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے کوئی ہٹ دھرمی اختیار نہ کر۔" طبری میں یہ خط موجود ہے جسے وہ ۷ ہجری کے حالات میں درج کرتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ خط جعفر طیارؓ کو بطور تعارف دیا گیا ہو، خط لے کر گئے ہون اور نجاشی کو ۵ نبوی میں دیا ہو کیونکہ ۷ ہجری میں مسلمان مہاجرین حبشہ میں پندرہ سال گزار کر مدینہ واپس جارہے تھے۔ واپسی کے وقت پناہ طلبی کے لیے تعارفی خط بھیجنا فضول سی بات نظر آئے گی۔ اس لیے مورخوں کے سکوت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مہاجرین مکہ کی اولین جماعت جس

وقت حبشہ گئی ہو گی اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ تعارفی خط دیا ہو گا۔ قطع کلام کر کے یہ عرض کرتا چلو کہ سہیلی کے مطابق یہ نجاشی ایک زمانے میں اپنے ظالم چچا کی وجہ سے عرب میں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوا، اور مقامِ بدر میں رہتا تھا۔ بدر وہ مقام ہے جہاں قریشی کاروان شام کو جانے اور وہاں سے واپس آنے کے وقت منزل کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی کاروانی سفر کے وقت، بعثت سے قبل، اس سے شخصی تعارف حاصل ہوا ہو۔ بہر حال مکہ میں رسول کریم ﷺ اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان ہو جانے والے لوگ بھی جہاں جہاں جاتے، اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق اپنے نئے دین کی تبلیغ شروع کر دیتے، جس سے متاثر ہو کر لوگ ایمان لے آتے۔ چنانچہ جعفر طیارؓ کو جب نجاشی کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع ملا تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ یہ لوگ ہم پر الزام کیوں لگاتے ہیں کہ فتنہ وفساد کرتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ کر سنائیں بالخصوص سورۂ مریم کی، جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے حکم سے بغیر باپ کے حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے مورخوں کا بیان ہے کہ یہ تفصیل سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ ان آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، حضرت عیسیٰؑ اس سے اتنے (اس تنکے کے برابر) بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہمیں مزید تفصلیں نہیں ملتیں کے آیا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن کچھ اشارے ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ اگر اس وقت نہیں تو بعد میں نجاشی ضرور مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق، جس دن نجاشی کی وفات کی خبر مدینے میں آئی رسول اللہ ﷺ نے اسی دن اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کسی غیر مسلم کے لیے نمازِ جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے یہ گمان کرنا چاہئیے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھجوائی تھی۔

تبلیغ کے سلسلے میں یہ چند ابتدائی باتیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کو اس سے بھی مشکل تر حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جب حبشہ بھیجی ہوئی مشرکینِ مکہ کی جماعت اپنے مقصد یعنی مسلمان مہاجرینِ حبشہ کو واپس مکہ لانے میں ناکام ہوئی تو وہ لوگ مقیم مکہ بقیہ مسلمانوں کو زیادہ سختی سے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانے لگے، اور باتوں کے علاوہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی کہ رسول ﷺ اور آپؐ کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے نہ کوئی شخص شادی بیاہ کے تعلقات رکھے، نہ ان کو بیٹی دے اور نہ ان سے رشتہ لے، نیز یہ بھی کہ نہ کوئی تجارتی چیز انہیں فروخت کرے، اور نہ ان کی دکان سے کوئی چیز خریدے، حتیٰ کہ ان سے بات چیت بھی نہ کرے۔ یہ قرارداد انہوں نے لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دی اور یہ عہد کیا کہ ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ یہ بائیکاٹ کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں متعدد مسلمان فاقہ کشی سے شہید بھی ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں نے ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں کہ انہیں یاد کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین۔ بالآخر وہ بائیکاٹ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل

میں میں نہیں جانا چاہتا۔ رسول اللہ ﷺ شہر واپس آتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اب شہر کے باشندوں سے بات چیت بھی ناممکن سی ہوگئی ہے اور لوگ اسلام کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو سوچنے لگتے ہیں کہ کیا کریں؟ اسی زمانے میں چچا ابو طالب کی وفات ہوگئی، اور نہ معلوم کس طرح دوسرا چچا ابو لہب قبیلے کا سردار بنا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کو "خلع" (یعنی جات باہر) کردیا کہ جو چاہے آپ کو جان سے بھی مار ڈالے، قبیلہ انتقام کی کوشش نہ کرے گا۔ اس پر حضورِ اکرم ﷺ مجبور ہوتے ہیں کہ شہر چھوڑ دیں اور کسی اور جگہ جا کر تبلیغ کریں۔ آپؐ شہر طائف کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہاں رسول اللہ ﷺ کے ننھیالی رشتہ دار تھے، گویا ماموؤں کا علاقہ تھا۔ آپؐ بہت پر امید ہو کر گئے لیکن وہاں مکے سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ماموؤں نے آپؐ کی حوصلہ شکنی کی اور دھمکی دی کہ آپؐ ان کا شہر چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ آپ کی جان کی خیر نہیں۔ مجبوراً آپؐ شہر سے نکلے تو ان لوگوں نے گلی کے شریر لڑکوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا: ان پر پتھر پھینکو اور انہیں ستاؤ۔ آپؐ زخمی ہوجاتے ہیں۔ شہر سے باہر آکر ایک باغ دیکھتے ہیں جس کے دروازے پر ایک دربان کھڑا تھا۔ آپؐ اس کی اجازت سے باغ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ دربان ایک نیک دل عیسائی تھا۔ اس نے شریر لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور اپنے مالک کی اجازت سے، جو مکے کا رہنے والا تھا اور اس وقت باغ میں موجود تھا، اس بے بس مہمان کی میزبانی کرنے لگا۔ انگور کا ایک خوشہ توڑ کر اس نے رسول اللہ ﷺ کو پیش کیا۔ اس وقت ایک واقعہ پیش آیا جسے شاید تبلیغ کا بالواسطہ طریقہ کہا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے "بسم اللہ" کہہ کر انگور کے ان دانوں کو کھانا شروع کیا۔ باغ کا مالی یا دربان حیرت سے پوچھنے لگا کہ تمہارے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ یہ کیا طریقہ ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے بتایا کہ میں نبی ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جو کام کروں، اللہ کا نام لے کر شروع کروں۔ پھر آپؐ نے دربان سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں عیسائی ہوں۔ میرا وطن نینویٰ کا شہر ہے (اسے آج کل موصل کہتے ہیں)۔ ایسی مصیبت آئی کہ اب غلام کی صورت میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس شہر کے باشندے ہو جہاں میرا بھائی یونسؑ رہا کرتا تھا۔ اس پر وہ عیسائی بے اختیار آپؐ کے قدموں کو بوسہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں یونسؑ نبی رہا کرتے تھے۔ کچھ اس طرح کی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ وہاں سے رخصت ہو کر مکے کی طرف لوٹے۔ تھوڑی دور جا کر آپؐ تھک کر ٹھہر جاتے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ آپؐ نماز میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ نماز کے بعد دکھے ہوئے دل سے آپؐ دعا کرتے ہیں جو آج بھی ہم پڑھیں تو دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہیں:

"اے اللہ! میں اپنی کمزوری اور بے بسی کی تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔ لوگ مجھے حقیر پاتے ہیں۔ مصیبت زدوں کا رب تو ہی ہے۔ اے میرے رب، کیا کروں؟ دور کے رشتہ دار درشتی سے پیش آرہے ہیں۔ قریبی رشتہ دار دشمن بن گئے ہیں۔ اس سب کے باوجود، اگر

تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو مجھے ان تکلیفوں کی پروا نہیں لیکن تیری طرف سے عافیت مل سکے تو وہ زیادہ خوشگوار ہو۔ میں پناہ صرف اس بات سے چاہتا ہوں کہ تو مجھ سے ناراض ہو جائے۔ میں تیری اور صرف تیری خوشنودی کا طالب ہوں۔ کسی بھی کام کی کوئی قوت، کوئی طاقت مل سکتی ہے تو وہ بس تجھی سے ہے۔" مختصر یہ کہ فرماتے ہیں: میں ان ساری مشکلوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور عازم ہوں کہ اپنے فریضے کی انجام دہی کو جاری رکھوں۔

یہ امتحانِ الٰہی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس میں حضور ﷺ کس شان سے کامیاب ہوتے ہیں۔ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ ابھی نماز اور دعا سے فارغ ہی ہوتے ہیں کہ قبولیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کی رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دینے کے لیے خدا نے ایک سورت نازل کی جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ قُلۡ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ ٱسۡتَمَعَ نَفَرٞ مِّنَ ٱلۡجِنِّ۔۔۔۔۔(۷۲ : ۱) (آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ جنوں کا ایک گروہ مجھے سن رہا ہے) اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا اور نہ ان کے وجود محسوس کیا۔ جب تک خدا نے اطلاع نہیں دی آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب رسول اللہ ﷺ صرف انسانوں کے لیے نبی نہ رہے، جنات کے لیے بھی نبی بن گئے۔ اگر انسان آپؐ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں تو کم از کم جنات کا ایک گروہ تو اسلام قبول کر رہا ہے۔ یہ روشنی کی پہلی کرن تھی جو اس تاریکی اور مایوسی کے عالم مین آپ کو دکھائی دیتی ہے۔

آپؐ آہستہ آہستہ پیدل مکہ واپس آجاتے ہیں۔ یہاں ایک نئی مشکل آپؐ کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ یہ کہ چچا کے طرد اور شہر مکہ کو چھوڑنے کے بعد آپؐ کی مکی قومیت ختم ہو گئی تھی۔ آپ اس وقت تک شہر مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے جب تک شہر مکہ کا کوئی باشندہ آپؐ کو پناہ نہ دے چنانچہ آپؐ ایک بدوی شخص کو کچھ رقم دے کر بھیجتے ہیں کہ میری ماں کے فلاں رشتہ دار سے جا کر کہو کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ وہ جاتا ہے مگر واپس آکر کہتا ہے کہ اس شخص نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ میں مکہ والا نہیں، طائف والا ہوں، اس لیے مکہ والوں کو اپنی پناہ دہی کا پابند نہیں کر سکتا۔ پھر اسی بدوی کو کچھ اور انعام دے کر ایک شخص کے پاس بھیجتے ہیں جو آپ کی بیوی حضرت سودہؓ کا رشتہ دار ہے۔ وہ بھی انکار کرتا ہے کہ میں چھوٹے خاندان کا آدمی ہوں۔ پھر اسی کو ایک تیسرے شخص کے پاس بھیجتے ہیں جو آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ کا رشتہ دار ہے۔ وہ قبول کر لیتا ہے اور اپنے بچوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہتھیار بند ہو کر آتا ہے رسول اللہ ﷺ کو اپنی حفاظت میں لے کر مکے میں داخل ہوتا ہے۔ حسبِ رسم اولاً رسول اللہ ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ کعبے کا طواف کریں اور پھر گھر جائیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ علی الاعلان کعبے کا طواف

کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر جاتے ہیں۔ یہاں میں یہ بیان کرتا چلوں کہ طائف کے اس سفر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے بڑے حامی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے: آپؐ کے چچا ابو طالب اور آپؐ کی بیوی حضرت خدیجہؓ۔ اسی افسردگی کے عالم میں آپؐ شہر چھوڑ کر طائف گئے تھے۔ اس شہر مکہ میں چچا ابو لہب کی دشمنی کے باعث آپؐ کی حیثیت اجنبیوں کی سی تھی جو مقامی باشندوں میں سے ایک کی پناہ میں رہتے تھے۔ جس سے میں یہ معنی اخذ کرتا ہوں کہ اب رسول اللہ ﷺ کو شہر میں آزادی نہیں تھی کہ سیاست میں حصہ لیں، یعنی تبلیغ دین کریں۔ اللہ نے اس کا حل بھی آپؐ کو بتا دیا۔ وہ یہ کہ شہر مکہ کے رواج کے تحت لوگوں کو ہر سال حج کے زمانے میں ایک طرح کا امنِ عام مل جاتا تھا۔ چنانچہ جو لوگ مجرم اور قاتل ہوتے تھے اور سارا سال چھپتے رہتے تھے وہ بھی حرام مہینے میں، یعنی حج کے زمانے میں، کھلم کھلا باہر نکل سکتے تھے اور آجا سکتے تھے۔ حضور ﷺ نے سوچا کہ شہر مکہ کے لوگ تو اسلام کے دشمن ہیں، ممکن ہے بیرونی قبائل یعنی غیر علاقوں سے آنے والے حاجی اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کوشش کی کہ حج کے زمانے میں باہر سے آنے والے قبائل میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ کافی جدوجہد کے بعد اس میں کچھ کامیابی ہوئی۔ ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ ﷺ کم سے کم پندرہ قبائل میں گئے۔ ہر ایک کو مخاطب کر کے یہ کہتے رہے کہ تم اسلام قبول کرو (جس کی یہ خصوصیات ہیں) تو جلد ہی قیصر قِصریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نثار ہو جائیں گے۔ مگر کسی نے قبول نہیں کیا، سوائے آخری سولہویں گروہ کے، جس میں صرف انصار کے چھ آدمی تھے۔ وہ یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ گویا آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔ یہ پہلی بیعتِ عقبہ ہے۔

بات یہ تھی کہ شہر مدینہ میں بہت سے یہودی بستے تھے اور ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی عربوں اور یہودیوں کا مدینے میں جھگڑا ہوتا تھا تو یہودی ان سے کہتے تھے "ذرا ٹھہر جاؤ، آج تو تم ہمیں مار رہے ہو لیکن جلد ہی آخری نبی آنے والا ہے، جب وہ آئے گا تو ہم اس کی اتباع کر کے تم کو دنیا سے نیست و نابود کر دیں گے۔ تمہارے بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد، سب کو قتل کر دیں گے۔" ان مدینے والوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعی آخری نبی ہیں تو کیوں نہ یہودیوں سے بھی پہلے اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے گفتگو کرتے ہیں۔ پھر سب لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ ان کا اسلام مخلصانہ تھا چنانچہ مدینے پہنچ کر وہ سب لوگ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ ایک سال بعد امن کے زمانے میں، یعنی حج کے مہینے میں، مدینے سے بارہ نئے آدمی مکے آتے ہیں اور بمقام عقبہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اس بیعت کے بعد ہمیں چند ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ان بارہ آدمیوں کو، جو بارہ مختلف قبیلوں کے نمائندے تھے، اپنی طرف ان قبیلوں میں نقیب یا سردار مامور کیا۔ اور انہی میں سے ایک کو نقیب النقباء۔ اس میں ایک طرف تو ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں تنظیم پسندی تھی اور مسلمانوں میں ایک مرکزی نظام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کو رسول اللہ ﷺ نامزد کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے ماتحت تھے۔ جو کسی کو نامزد کرتا ہے وہ اس کو معزول بھی کر سکتا ہے۔ اس نامزدگی کے بعد وہی لوگ رسول اللہ ﷺ سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہمیں ایسا معلم دیجئے جو اسلام سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہو اور دینے میں ہمیں دین بھی سکھائے اور تبلیغ بھی کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کو روانہ کیا جو بہت ہی مخلص مسلمان تھے اور نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ ان میں لوگوں کو اسلام پر آمادہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انہیں بہت ہی شاندار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ بیسیوں لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ انتہائی اجڈ لوگ بھی اسلام قبول کرتے تھے۔

اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک دن حضرت مصعب بن عمیرؓ نے ایک باغ میں جا کر وہاں کے لونڈی، غلاموں اور بچوں کے سامنے تبلیغ شروع کر دی۔ مالک کو یہ تماشہ برا لگا۔ اس نے ایک آدمی کو بھیجا کہ اس کو ڈانٹ کر نکال دو کہ ہمارے باغ میں اس طرح بلا اجازت آ کر کیوں فساد کر رہا ہے؟ وہ شخص پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے بہانہ کیا اور واپس جا کر مالک کو بتایا کہ میں نے اسے بہت ڈانٹا مگر وہ نہیں مانتا، تم خود جا کر اسے نکالو۔ اصل میں اس کا منشاء یہ تھا کہ یہ مالک بھی اسلام کی باتیں سنے اور اس شخص کی زبانی سنے، جو اپنی جادو بیانی اور طاقتِ لسانی سے ہر شخص کو اسلام کا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ وہ سردار بڑے طنطنے سے نیزہ ہلاتا ہوا آیا اور دھمکی دی کہ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مصعب بن عمیرؓ گھبرانے کی بجائے مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ معلوم کیے بغیر کہ میں کیا کہہ رہا تھا، تم مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم پہلے سن لو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے، تم کہو گے تو میں چلا جاؤں گا۔" وہ اجڈ شخص اپنے نیزے کو زمین میں گاڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ انہوں نے حسبِ عادت قرآن مجید کی ایک سورۃ کی تلاوت کی۔ تلاوت شروع ہوتے ہی اس کو سکون آ گیا۔ چہرے پر خشونت کی جگہ سکون اور ایک نئے شعور کی روشنی پھیل گئی۔ پھر قبل اس کے کہ سورہ کی تلاوت ختم ہوتی، وہ شخص اٹھا اور پوچھنے لگا کہ مجھے مسلمان ہونے کا طریقہ بتاؤ۔ چنانچہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر اپنی عادت کے مطابق سابقہ اجڈ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے زور سے نیزہ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کے اندر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آؤ، سب میرے پاس آؤ۔ چنانچہ عورتیں، بچے اور غلام سب بھاگ کر اس کے پاس آتے ہیں۔ اس نے سب سے پوچھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ سب نے کہا' آپ

ہمارے سردار ہیں۔ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔ تب اس نے کہا 'میرا حکم ہے کہ تم سب مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم مجھ سے زیادہ کسی کو اپنا دشمن نہ پاؤ گے۔' اس طرح پورا خاندان مسلمان ہو جاتا ہے۔۔ جب سردار مسلمان ہو تو ظاہر ہے کہ سردار کے ماتحت لوگوں کا مسلمان ہو جانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں اسلام پھیلنے کے یہ مختلف طریقے نظر آتے ہیں، یہ ان میں سے ایک تھا۔

یہ چیزیں ہمیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری زمانے تک ملتی ہیں۔ دو ایک مثالیں اور دے کر میں اس بیان کو ختم کروں گا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے مکان میں ایک اجنبی مہمان آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس کو کھانے کو بھی دیتے ہیں اور رات گزارنے کے لیے کمرہ بھی دیتے ہیں۔ وہ بدنیتی اور دشمنی کے ساتھ آیا تھا۔ علی الصبح کمرے میں بستر پر غلاظت کر کے، قبل اس کے کہ لوگ بیدار ہوں، اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ صبح کو جب رسول اللہ ﷺ وہاں آئے اور غلاظت دیکھی تو اس کو اپنے دستِ مبارک سے دھویا، بستر کو پاک صاف کیا۔ پھر دیکھا کہ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار وہیں بھول گیا ہے۔ کچھ دور جا کر اس اجنبی کو بھی تلوار یاد آئی اور آہستہ آہستہ واپس آیا کہ ابھی لوگ سو رہے ہوں گے۔ میں تلوار لے کر پھر واپس چلا جاؤں گا۔ مگر اس نے دیکھا کہ رسول اکرم ﷺ بیدار ہو چکے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بستر کو صاف کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ اسے ڈانٹیں یا دھمکائیں، آپؐ فرماتے ہیں کہ تم اپنی تلوار بھول گئے تھے، یہ تلوار رکھی ہے، لے لو۔ اس سلوک کے نتیجے میں وہ بے ساختہ پکار اٹھا: "اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ"۔

ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے جاتے ہیں۔ فوج کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ جاتا ہے۔ دور تو نہیں بھاگتا۔، کیونکہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر کسی درے یا وادی میں چلا جاتا ہے۔ اس دشمن قبیلے کا سردار پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کے دور تاکتا رہتا ہے کہ یہ فوج کیا کرتی ہے۔ اس دن بارش ہوئی۔ چنانچہ بارش کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ خود رسول اللہ ﷺ تنہا ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اور اپنا کرتا درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ دشمن جو اوپر سے تاک رہا تھا، دیکھتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ تنہا سوئے ہوئے ہیں۔ آتا ہے اور تلوار کھینچ کر چلا کر کہتا ہے: "اے محمدؐ! تجھے اب میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" رسول اکرم ﷺ بہت ہی سکون کے ساتھ کہتے ہیں: "اللہ"۔ اس جواب سے اس پر اتنا رعب ہوا کہ ہاتھ میں تھرتھری پیدا ہو گئی اور تلوار ہاتھ سے گر گئی۔ تلوار کو اب رسول اللہ ﷺ خود اٹھا کر کہتے ہیں: "اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" وہ کہتا ہے: "کوئی نہیں۔" تو آپؐ اس کو اس کی تلوار واپس کرتے ہیں کہ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ وہ اس مرحمت پر اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے

اور کہتا ہے کہ اب میں اپنے قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کروں گا۔ اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضور اکرم ﷺ جب عام معافی کا اعلان کرتے ہیں تو اس کے ردعمل کے طور پر لوگ جوق درجوق مسلمان ہوتے ہیں اور راتوں رات سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ یہ تھے وہ طریقے جو تبلیغِ اسلام کے لیے رسول اکرم ﷺ نے اختیار فرمائے اور نتیجہ ہمیں واضح نظر آتا ہے۔

اس سے پہلے کے انبیاءؑ کی زندگی میں ان کے ہاتھوں پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد کا ہم رسول اکرم ﷺ کی کامیابی سے مقابلہ کریں تو یہاں بھی آپ کو غیر معمولی فوقیت نظر آتی ہے۔۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق انجیل میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس آدمی ایمان لائے ہوں گے۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی قوم بنی اسرائیل کے لوگ جن کی تعداد بائبل کے مطابق پانچ لاکھ تھی، ان کا ساتھ دے رہی تھی، لیکن ایک خود غرضی کے تحت تاکہ فرعون کے ظلم سے نجات پائیں۔ سچے دل سے ایمان لانے والوں کی تعداد تقریباً صفر تھی۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکلنے کے بعد ایک دن اس سے مخاطب ہو کر کہا: "خدا نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں ملک فلسطین کا ملک دے گا، آگے بڑھو اور اس ملک پر قبضہ کر لو۔" تو انہوں نے کہا کہ "ان جباروں سے ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے خدا نے وعدہ کیا ہے تو تم اور تمہارا خدا دونوں (فلسطین پر قبضہ کرنے) جاؤ ہم تو یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔" (قرآن ۵ : ۲۴) دوسرے الفاظ میں ساری قوم کافر اور نافرمان ہو جاتی ہے۔ آپ کی بات قبول کرنے اور ایمان لانے سے سے انکار کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف دو آدمی تھے، جنہوں نے ایسا نہیں کیا، اور حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی: ایک آپ کے بھائی حضرت ہارونؑ اور دوسرے آپ کے خادم حضرت یوشع جو بعد میں نبی بنے۔ ان دونوں کے سوا سارے بنی اسرائیل میں سے کسی نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارہ (۱۲) بہت ہی مخلص حواری تھے۔ ان میں سے سینٹ پیٹر کا نام آپ نے سنا ہو گا جن کی قبر (ویٹی کن) اٹلی میں ہے۔ ان کے متعلق انجیل ہی میں حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے: "جا او شیطان۔" یہ ان کی کسی حرکت یا طرزِ عمل کی بنیاد پر کہا ہو گا۔ تفصیلات مجھے معلون نہیں۔ ایک اور حواری یہودا تھا جس کے متعلق تو صراحت ملتی ہے کہ اس نے ارتداد اختیار کیا۔ پولیس کو حضرت عیسیٰؑ کی ضرورت تھی اور وہ انہیں تلاش کر رہی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ غائب ہو گئے تھے۔ تو اس ساتھی نے جو مرتد ہو گیا تھا، پولیس کو مخبری کی اور حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرا دیا۔ اس کے برخلاف حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو ہمارے پاس نہیں لیکن ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی تعداد کا ایک حد تک تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ حجۃ الوداع کے متعلق جو وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے، ہمارے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس وقت میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اسلام میں حج کوئی ایسا فریضہ نہیں کہ ہر شخص کو ہر سال ادا کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ جتنے

لوگ مسلمان ہوئے تھے، سب کے سب وہاں اس سال حج کے لیے نہیں آئے ہوں گے۔ کچھ لوگ گھروں میں رہے، کچھ لوگ آئے۔ اگر بالفرض ہر پانچ میں سے ایک شخص آیا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب مسلمانوں کی تعداد کم و بیش پانچ چھ لاکھ ہو گی۔ کہاں تیس چالیس آدمی، کہاں لاکھوں کی تعداد۔ ہمیں اسلام کی تاریخ میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد شاذونادر ہی کسی نے ارتداد کیا ہو، عہدِ نبویؐ میں ارتداد کی ایک آدھ مثال ہمیں نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد نہیں ہوئے بلکہ وہ منافق تھے۔ منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اسلام کو اندر سے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن جب ان کی چلی نہیں تو بھاگ نکلے اور پھر اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ غرض یہ چند خاص باتیں جو تبلیغ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے متعلق اسلام کا برتاؤ کیا ہے۔ مختصراً بیان کرتا ہو۔ اس آیت سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہو گا: "لا اکراہ فی الدین" (۲: ۲۵۶) — " ان علیك الا البلاغ" (۴۲: ۴۸) یعنی اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ پیغمبر کا فریضہ صرف ابلاغ و تبلیغ ہے، اس کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئیے؟ قرآن میں یہ عجیب و غریب اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی کمیونٹی کو کامل داخلی خود مختاری دی جائے گی حتیٰ کہ نہ صرف عقائد کی آزادی ہو اور اپنی عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں بلکہ اپنے ہی قانون، اپنے ہی ججوں کے ذریعے سے اپنے مقدمات کا فیصلہ بھی کرائیں۔ کامل داخلی خود مختاری کا قرآن کی کئی آیتوں میں ذکر ہے۔ جن میں سے ایک آیت بہت ہی واضح ہے: "ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ" (۵: ۴۷) یعنی انجیل والوں کو چاہئیے کہ اس چیز کے مطابق احکام دیا کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ ان احکام کے تحت عہدِ نبویؐ ہی میں قومی خود مختاری ساری آبادی کے ہر ہر گروہ کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین، عبادات، قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے، اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی کامل آزادی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مسلمان جنگ کر کے اسلامی مملکت، ریاست اور اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے، جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا امن و ایمان سے متمتع ہوتی ہے جب کہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لیے سر کٹاتے ہیں۔ لہٰذا فوجی ضروریات کے تحت غیر

مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عاید کیا جاتا ہے، جو جزیہ کہلاتا ہے۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے ایران وغیرہ میں بھی جو لوگ فوجی خدمت سرانجام نہیں دیتے تھے، ان کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیز اسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم رعایا بہت ہی خفیف ٹیکس دے کر، جو سال میں دس دن کی غذا کے مترادف تھا، اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے، یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوتے، دولت کماتے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز غیر مسلموں کے متعلق ہمیں نظر آتی ہے کہ محض دین کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ۲ ہجری میں جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مکے والوں نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا اور چاہا کہ وہاں جو مسلمان مہاجرین مقیم ہیں ان کو نئے نجاشی سے کسی طرح واپس حاصل کر لیں اور ان کو تکالیف دیں۔ جب اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ الضمری کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ان کی حفاظت کے لیے حکمران کو آمادہ کرے۔ حالانکہ عمرو بن امیہ الضمری اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ہمسائے میں یہودی رہتے تھے، اگر ان کے یہاں کوئی بچہ بھی بیمار ہوتا تو رسول اکرم ﷺ اس بچے کی عیادت کے لیے اس کے گھر جایا کرتے۔ بنی عریض نامی ایک یہودی قبیلہ مدینے میں رہتا تھا۔ اس کی کسی بات سے خوش ہو کر رسول اکرم ﷺ نے اس کے لیے کچھ سالانہ معاش مقرر فرمائی۔ یہ مختلف چیزیں ہیں جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور چیز کہ مسلمان کا ہی نہیں یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں میں سے گزرتا اور اتفاق سے رسول اکرم ﷺ وہاں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر آپ کھڑے ہو جاتے تاکہ ان کے ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ غرض مسلمانوں کا طرزِ عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اس کی نظیر ہمیں تاریخ عالم میں کم ملتی ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کی طرف اشارہ کر کے میں اسے ختم کرتا ہوں: رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بارہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ کسی بھی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ نہ اس فریق کا ساتھ دیتے، نہ اس فریق کا ساتھ دیتے، موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال انہیں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے زمانے میں جب قیصر روم نے پیام بھیجے اور اسلامی ممالک کی عیسائی رعایا سے کہا کہ موقع ہے کہ تم بغاوت کرو۔ میں بھی اس وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا، اور ان مشترکہ دشمنوں سے ہم نجات پائیں گے، اس ابتدائی زمانے سے لے کر کروسیڈز (صلیبی جنگوں) تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کیے، تو

مسلمانوں کی عیسائی رعایا کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کافر حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم جیسے ہم مذہب حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے کے لیے جبر نہیں کرتے تھے اور ان کو مذہبی و قومی معاملات میں پوری آزادی وخود مختاری دیتے تھے، حتیٰ کہ ان کے مذہبی اداروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے یہ خوشخبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے۔ لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی، اس کے بر خلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور ہمارے راہب خانوں Convents کی مالی امداد کرتی ہے۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سوال و جواب

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

سوالات جو آج کے اجتماع کے دوران کیے گئے ہیں، ان کے متعلق میں کچھ مختصراً عرض کروں گا۔ امید ہے آپ میری تقصیروں اور کوتاہیوں کو جو جوابات کے متعلق اور اپنی ساری گزشتہ تقریروں کے متعلق مجھ سے ہوئی ہیں، معاف فرمائیں گے۔ کیونکہ انسان اپنی معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر مجھ میں کوئی قابلیت، کوئی خصوصیت ہے تو وہ یہی ہے کہ میں اپنی تقصیر کو ماننے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا ہوں۔

سوال ۱: آپ کے بیان کے مطابق ﷺ کے پیروکاروں کا تناسب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں سے کافی زیادہ تھا۔ کیا وجہ ہے کہ موجودہ دور میں وہ تناسب نہیں ہے؟

جواب: اس کے دو جواب ہوسکتے ہیں۔ ایک جواب قدرت کے متعلق ہے اور دوسرا جواب خود آپ کے ہمارے متعلق ہے۔ قدرت کے متعلق میں اس لیے کہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری تک چھ سو سال کا وقفہ ہے لہٰذا عیسائیوں کو ہم پر چھ سو سال کی سبقت حاصل ہے۔ انشاءاللہ آئندہ چھ سو سال کے بعد ہماری حالت وہ نہیں رہے گی جو آج ہے۔ یہ قدرتی صورت حال ہے۔ جو اس کی توجیہ کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ یوں بھی رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت دنیا میں عیسائیوں کا جو تناسب تھا وہ بہر حال اب باقی نہیں ہے۔ ان عیسائیوں میں سے کروڑوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن گستاخی معاف ہو، اگر میں یہ کہوں کہ ان سے زیادہ یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ کیا ہم اپنے اطراف میں نہیں دیکھتے کہ عیسائی مشنری کس تن دہی، کس جوش و خروش اور اور کس خلوص کے ساتھ اپنا دین پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر خطے میں جاتے ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی سردیوں میں بھی اکڑتے، اور خطِ استوا کی گرمیوں میں بھی جھلستے ہیں اور اپنا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے سبق آموز چیز ہے۔ تبلیغ، اسلام کے سلسلے

مین ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتے۔ پھر ہم اس بات کی کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہماری تعداد عیسائیوں کی تعداد سے زیادہ ہو۔ اس کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان درست نہیں ہے کہ موجودہ دور میں عیسائیوں کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں اب اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

سوال ۲: اگر خلیفہ وقت یا اقتدارِ اعلیٰ قتل یا طبعی موت سے فارغ عہدہ نہ ہو تو کیا کوئی ایسا اسلامی طریقہ ہے جس سے انہیں علیحدہ کیا جانا ممکن ہو؟ براہ کرم کسی مثال یا نظیر سے مطلع فرمائیں۔

جواب: میرا پہلا جواب یہ ہے کہ آپ کو ایسی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد، یکجہتی اور تعاون ہو۔ یہ نہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر اپنے دشمنوں کو موقع دیں کہ ہم پر حاوی ہو جائیں۔ دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ مسلمان فقہاء کے بیان کے مطابق حکمران یا خلیفہ کی حیثیت ایک وکیل کی ہے اور مؤکل جو کسی شخص کو اپنا وکیل بناتا ہے اس بات کا ہمیشہ حق رکھتا ہے کہ اپنے وکیل کو معزول کرے۔ جو لوگ کسی کو حکمران بنائیں گے انہی کو یہ حق بھی ہو گا کہ اس کو اس خدمت سے الگ کریں۔

سوال ۳: آپ نے کل ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ استاد کے لیے شاگرد کا دیا ہوا ہدیہ لینا مناسب نہیں۔ ہمارے علماء تقریریں کرنے کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ ہر شخص کی ضرورتیں ہوتی ہیں، اس لیے کوئی عام حکم نہیں دیا جا سکتا۔ ایک مثال دیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ کو رسول اکرم ﷺ نے ایک خدمت پر مامور کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ زکوٰۃ وغیرہ کی تحصیل کا کام تھا۔ یہ کام انجام دینے کے بعد جب وہ واپس آئے تو رسول اکرم ﷺ نے ان کی تنخواہ کے طور پر کچھ رقم عطا کی۔ حضرت عمرؓ نے ادب کے ساتھ اس کو لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس مال کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ کام اللہ کے لیے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ یہ رقم دوسری ضروریات کے لیے صرف فرما سکتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں لے لینا چاہیئے۔ لینے کے بعد کسی کارِ خیر میں لگا دو، لیکن لینا چاہیئے۔ یہ بخاری کی بیان کردہ حدیث ہے۔ منشاء اس سے یہ ہے کہ کچھ تو حکومت کے فرائض ہیں جن کے لیے کسی شخص کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف جس شخص سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے اپنے مسائل اور اپنی ضرورتیں ہوں گی۔ ان تمام چیزوں کا ہمیں لحاظ رکھنا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ

کے لیے کافی ہو گا۔ پھر آپ اس کے لیے خود فیصلہ فرما سکتے ہیں۔

سوال ۴: یہ بتایا گیا ہے کہ مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے۔ جس میں کم و بیش یہ الفاظ ہیں کہ خدا نے مجھ کو معارف اور مزامیر کے نابود کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

جواب: اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ظاہر ہے میرے لیے یا کسی مسلمان کے لیے سوائے سرِ تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اس کے باوجود دو چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک چیز علمی ہے جس کے بیان کرنے کے لیے وقت چاہیئے اور دوسری چیز وہ فوری ردِ عمل ہے جو اس حدیث کو پڑھنے سے ذہنوں میں آتا ہے۔ لیکن میں سب سے پہلے ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کروں گا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ رسول کریم ﷺ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ستار کے تاروں کو توڑنے کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے لیکن اب تک صحیح حوالے کے ساتھ کوئی حدیث بیان نہیں کی گئی۔ حدیث کی کتابوں روایت کے ساتھ ساتھ اس کے مصادر بیان کئے جاتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے، فلاں نے فلاں سے، اس کی روایت کی ہے۔ جس طرح ہم حدیث پر عمل کے پابند ہیں، چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے، اسی طرح اس بارے میں اولاً یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ روایت صحیح بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ان راویوں کی سوانح دیکھنی ہوں گی اور یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ان راویوں کے متعلق ہمارے علمائے سلف نے کیا رائے قائم کی ہے۔ اس تحقیق کے ختم ہونے تک، جس کا مجھے یہاں وقت نہیں مل سکتا۔ کوئی رائے اس مسئلے کے متعلق قائم نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال حدیث کے تمام الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کی بتوں کی پوجا اور پرستش کے لیے جو گانا بجانا ہوتا ہے، میں اس کو محو کرنے آیا ہوں۔ یہاں گانے بجانے کا ذکر بتوں کی پرستش کے سلسلے میں آیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے۔ بتوں کے حوالے کو نظر انداز کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنا مناسب نہ ہو گا۔

سوال ۵: حضرت امِ ورقہؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو آپ ﷺ نے گھر کی عورتوں کا امام بنایا تھا۔ کیا عورت صرف عورتوں کی امامت کر سکتی ہے، مردوں کی نہیں؟

جواب: میں اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ صرف عورتوں کے لیے امام بنایا گیا تھا۔ حدیث میں یہ الفاظ ہیں "اہل خاندان" کے لیے۔ "اہل" کے معنی صرف عورتوں کے نہیں ہوتے پھر اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کا ایک موذن تھا، جو مرد تھا۔ اور مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں کہ ان کے غلام بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ غلام بھی ان کی امامت میں ہی نماز پڑھتے ہوں

گے۔ غرض یہ کہ امامت صرف عورتوں کے لیے نہیں تھی بلکہ مردوں کے لیے بھی تھی۔

سوال۶: رسول اللہ ﷺ طائف میں تقریباً ڈیڑھ ماہ رہے۔ آپؐ نے وہاں کس کے ہاں قیام کیا؟

جواب: مجھے اس کا علم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشکل سے ایک دن وہاں رہے۔ ڈیڑھ مہینے کی روایت میں نے نہیں پڑھی۔ ممکن ہے صحیح ہو مگر قرین قیاس نہیں۔

سوال۷: غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ روایت میں آیا ہے کہ نجاشی کی وفات کے وقت تمام پردے ہٹا دیے گئے اور رسول اکرم ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ذرا وضاحت فرمائیں۔

جواب: جہاں تک بخاری کی روایت کا تعلق ہے جو حدیث کی مستند کتاب ہے اس میں اس جزو کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ "تمام پردے ہٹا دیے گئے۔" اگر کسی روایت میں ہو تو میں نے کبھی نہیں پڑھی۔ بہر حال ایک واقعہ بہ صراحت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس شخص کی وفات کے بعد جو کسی اور ملک میں ہوئی تھی، مدینہ منورہ میں نمازِ جنازہ پڑھائی اور اب مسلمان چودہ سو سال سے ایسا ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ ہم اپنے کسی مسلمان بھائی یا بہن کی مغفرت کے لیے ایک سے زیادہ وقت میں یا ایک سے زیادہ مقام پر نمازِ جنازہ ادا کریں۔

سوال۸: حضور اکرم ﷺ کسی غیر مسلم کو مسلمان کو مسلمان کرتے وقت کیا پڑھاتے تھے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہی کلمہ ہوتا تھا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ ممکن ہے کچھ اور تفصیلات ہوتی ہوں مثلاً پوچھا جاتا ہو کہ تم نماز پڑھو گے؟ کیا تم روزہ رکھو گے؟ کیا تم اسلام کے احکام پر عمل کرو گے؟ تاکہ آدمی سوچ سمجھ کر اسلام لائے، یہ نہیں کہ بعد میں واقفیت پر رائے بدل دے۔ اس طرح کی جو چیزیں ہو سکتی ہیں، وہ مختلف افراد کے لحاظ سے مختلف بھی ہو سکتی ہیں، لیکن کئی بار اس کا ذکر آیا ہے کہ صرف "لا الہ لا اللہ محمد رسول اللہ" کہا گیا اور قصہ ختم ہو گیا۔

سوال۹: کیا مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کے لیے اسلامی مملکت کا دوبارہ قیام کرنا ضروری نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس کے کیا امکانات ہیں اور ایسا کرنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں؟

جواب: اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ سوائے اس کے کہ یہ میری بھی تمنا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اگر میں کسی ملک کا حکمران ہوتا تو اسکے لیے آمادہ رہتا کہ کسی اور بہتر شخص کے لیے اپنی جگہ خالی کر دوں کہ تم ان دونوں ملکوں کے بادشاہ ہو جاؤ۔ لیکن ایسا نہیں ہے، اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ یہ کام حکمرانوں کے کرنے کا ہے۔

سوال ۱۰: آج کل کے حالات میں تبلیغ کی ضرورت غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں میں کرنے کی ہے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب: مجھے اس سے اتفاق ہے بھی اور نہیں بھی۔ اتفاق اس معنی میں ہے کہ اگر مسلمانوں کا کردار اچھا ہو تو اس کردار کا اثر دیکھنے والے غیر مسلموں پر پڑتا ہے۔ لیکن اختلاف بھی ہے اور وہ اس معنی میں کہ اگر ہم انتظار کریں کہ سارے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں، اس کے بعد ہم تبلیغ کریں تو یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ دونوں کام بیک وقت جاری رہیں۔ ہم مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے لیے بھی کام کریں اور غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے کی بھی کوشش کریں۔

سوال ۱۱: غیر مسلموں کے ساتھ مثالی رواداری کے باوجود مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے؟ "لا اکراہ فی الدین" (۲:۲۵۶) کے باوجود ایسا حکم دینے کا کیا جواز ہے؟

جواب: اس بارے میں میرا شخصی ردعمل یہ ہے کہ مرتد کو سزائے موت دینے کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں۔ اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی امت کا رکن بننے کے لیے جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا بھی دی جائے گی۔

سوال ۱۲: غیر ممالک خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں تبلیغی جماعت کی تبلیغ کے کیا نتائج مرتب ہوئے ہیں؟ کیا اس جماعت کی کارکردگی کافی مؤثر ثابت ہو رہی ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیوں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: مجھے اور ممالک کا علم نہیں لیکن پیرس شہر کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ بیس سال سے یہ جماعتیں وہاں آنے لگی

ہیں اور میں نے اس کے اچھے نتائج دیکھے ہیں۔ اب سے بیس سال پہلے پیرس شہر کے مسلمانوں میں اگر نماز پڑھنے والوں کی تعداد ہزار میں سے ایک تھی تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ نہیں تو سو میں سے پچاس ہو گئی ہے۔ یعنی پچاس فیصد لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ یہ تبلیغی جماعت کی کوششوں کا اثر ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۴ سے پیرس میں ایک بہت عظیم لشان مسجد ہے لیکن اب گزشتہ بارہ سالوں سے یہ مسجد ناکافی ثابت ہو رہی ہے، چنانچہ شہر میں روز بروز نئی مسجدیں بننے لگی ہیں یا کوئی عمارت کرائے پر لے کر اس سے مسجد کا کام لیا جاتا ہے یا خود عیسائیوں کی طرف سے فروخت کیے جانے والے گرجاؤں کو خرید کر مسجدوں میں بدلا جارہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت میرے علم میں شہر پیرس اور اس کے مضافات میں اسی (۸۰) سے زائد مسجدیں ہیں۔

سوال ۱۳: سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں رسول اکرم ﷺ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا نام کیوں نہیں لیا جاتا؟ جبکہ ان کے ہم عمر یا ان سے بھی کم عمر حضرت علیؓ کا نام لیا جاتا ہے۔

جواب: میرا منشاء یہ نہیں تھا کہ سارے ابتدائی مسلمانوں کا نام بیان کروں۔ اس لیے میں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ صرف چند نام گنوائے جن سے لوگ واقف ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ بعثت کے وقت بی بی ابھی والدین کے گھر ہی میں تھیں کہ فوراً مسلمان بنیں یا شادی ہو کر شوہر کے پاس جا چکی تھیں۔ صرف یہ ذکر آتا ہے کہ وہ شوہر کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئیں اور بعد میں شوہر مسلمان ہوئے تو نکاح سابق ہی پر وہ شوہر کے گھر چلی گئیں۔ نکاح کب ہوا تھا معلوم نہیں۔

سوال ۱۴: جب کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی برات بیان فرمائی اور مسلمانوں کو ان کے حواریوں کی اتباع کا حکم دیا ہے تو پھر بھی حوارین یعنی صحابہ ٔحضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟

جواب: آیت یہ ہے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ"۔ میں نے اپنی طرف سے مطعون نہیں کیا بلکہ میں نے انجیل کے حوالے سے بیان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک حواری سینٹ پیٹر کو ان الفاظ میں جھڑکا تھا: "جا او شیطان۔" اس سے زیادہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ یہی حال یہوداا سخریوطا حواری کا ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروایا تھا۔

سوال ۱۵: آپ نے تقریر کی ابتداء میں ورقہ بن نوفل کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ اس واقعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے رسول ہونے کا علم نہیں تھا۔ جب کہ ورقہ بن نوفل یہ جانتا تھا۔ کیا اس بیان سے رسول اللہ ﷺ کی سبکی نہیں ہوتی؟ کیا نبی وقت کا سب سے بڑا عالم، وقت کی سب سے بڑی کامل و جامع شخصیت تسلیم نہیں ہوتا۔ کیا وہ کسی فرد سے کم تر ہو کر نبی ہو سکتا ہے؟

جواب: جو مفہوم میں آپ کا سمجھ سکا ہوں اس کا جواب عرض کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کو جب پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخصیت آپؐ کے سامنے آکر کہتی ہے کہ میں جبرئیل ہوں اور خدا نے مجھے بھیجا ہے اور آپؐ کو اللہ نے اس امت کا نبی بنایا ہے۔ اس واقعے کی تفصیل آپ ابن ہشام میں پڑھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ خواب میں پیش آیا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نیند سے بیدار ہوئے تو آپؐ کو کچھ تذبذب تھا اور وہ تذبذب کچھ عرصے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ جب یہ بات مکرر ہوتی ہے اور جبرئیل دوبارہ آپ کی بیداری میں آتے ہیں تو اس طرح توثیق (Confirmation) ہو جاتی ہے لیکن پہلی وحی اور دوسری وحی میں تین سال کا طویل وقفہ ہے۔ اس عرصے میں فطرتِ انسانی کے تقاضے سے شروع شروع میں کچھ خوف کا احساس ہوا۔ پھر جب خوف دور ہو جاتا ہے تو یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش! اس تجربے کا دوبارہ اعادہ ہو۔ پھر اس کے بعد شوقِ انتظار ایک خلش کا روپ اختیار کرتا ہے اور بالآخر یہ کیفیت پیش آتی ہے کہ آدمی مایوس ہو کر سمجھے کہ شاید گزشتہ واقعہ محض ایک وہم تھا۔ چنانچہ ہماری کتابوں میں یہی روداد ملتی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ شدید مایوسی کے عالم میں ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے خودکشی کی کوشش فرمائی۔ قصہ یہ ہے کہ ایک دن آپ کی چچی، ابولہب کی بیوی نے طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے تیرا وہ شیطان تجھ سے خفا ہو کر تجھے چھوڑ چکا ہے۔ آپؐ کے صبر و انتظار کے پیمانے میں یہ آخری قطرہ گرا تو وہ چھلک پڑا۔ اس وقت آپ انتہائی جوش کی حالت میں شہر سے نکلتے ہیں، ایک پہاڑی کی چوٹی پر چڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیں۔ اس وقت جبرئیلؑ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (قرآن ۹۳: ۳) نہیں، اللہ نے آپؐ کو چھوڑا نہیں ہے۔ آپؐ برحق نبی ہیں۔ پھر اس کے بعد آپ کو سکون ہو جاتا ہے اور وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں رسول اکرم ﷺ کو آپ فرشتہ نہ سمجھئے۔ وہ ایک بشر تھے۔ قرآن مجید بار بار کہتا ہے: "انما انا بشر مثلکم" (۱۸: ۱۰)۔ رسول اکرم ﷺ کا ردِ عمل بشری تقاضوں کے مطابق ہے۔ اگر ابتداء میں شبہ پیدا ہوا، تو وہ انکار کے باعث نہیں تھا بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تقاضائے بشری کے باعث تھا، پھر جو کاہن اور جادوگر تھے۔ ان کے حالات سے بھی آپؐ واقف تھے۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کسی غیبی شخصیت نے آکر فلاں فلاں چیزیں بتائیں تو اس بنا پر شبہ پیدا ہونا ایک لازمی اور طبعی بات تھی اور اس کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ مجھے شیطان نہ بہکائے۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں تھی۔

سوال ۱۶: حضور ﷺ اور ان کے اہلِ خانہ نے شعب ابی طالب میں پناہ لی۔ کیا شعب ابی طالب میں پناہ لینے والے سارے مسلمان تھے یا ان میں غیر مسلم بھی شامل تھے؟ اگر ابو طالب نے کچھ عرصہ شعب میں پناہ لیے رکھی، بھوک وغیرہ برداشت کی تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تفصیلات آپ کو آسانی کے ساتھ سیرت کی ہر کتاب میں مل سکتی ہے۔ مکہ والوں نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ خاندانِ بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے لہٰذا مسلم و غیر مسلم جتنے افراد تھے سب پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ ہماری کتابوں میں مثلاً بلاذری کی کتاب میں صراحت کے ہے کہ اور غیر مسلموں نے خاندان کا ساتھ دینے کے لیے ساتھ دیا لیکن ابو لہب نے خاندان کو اور شعب ابی طالب کو چھوڑ کر شہر میں آکر مشرکوں سے کہا کہ میں خود کو مستثنیٰ کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ میں بتوں کی حمایت کروں گا۔ ان حالات میں دونوں مسلم اور غیر مسلم وہاں تھے۔ غیر مسلموں نے خاندانی حمیت کی خاطر ساتھ دیا اور مسلمانوں نے مجبوری کے تحت ایسا کیا تھا۔ رہا بھوک پیاس کا برداشت کرنا، اگر ہم قبول کرتے ہیں کہ خاندان کے ساتھ ہم اپنا تعلق برقرار رکھیں گے تو اس کے نتائج کو برداشت کرنا ہوگا، چنانچہ انہوں نے برداشت کیا۔ کچھ لوگ اس بھوک اور پیاس کی تلیف اٹھا کر بیمار بھی ہوتے رہے۔ کچھ لوگ جاں بحق بھی ہوئے۔ لیکن بہر حال انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

سوال ۱۷: مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں تو پیغمبر تھے اور مدینے میں بادشاہ بن گئے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: میری اس بارے میں رائے یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ مکے میں نبی تھے۔ اس سے دشمن کو بھی انکار نہیں۔ مدینے میں صرف بادشاہ تھے، اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ مدینے میں آپؐ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ یعنی آپؐ کے ابتدائی پرانے فرائض میں اب اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اگر نبی کے فرائض یہ ہیں کہ دین کی تبلیغ کرے، عبادت کے طریقے بتائے، عقائد کی اصلاح کرے تو رسول اللہ ﷺ بعثت سے لے کر وفات تک مکے اور مدینے دونوں جگہ یہی فرائض انجام دیتے رہے۔ شکریہ، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔